کُلیاتِ پطرس

جلد اوّل

سیّد احمد شاہ پطرس بخاری

مرتبہ: شیما مجید

بک ٹاک

میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی

گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔ ہماری جو شامت آئی تو ایک دن اپنے پڑوسی لالہ کرپاشنکر جی برہمچاری سے برسبیل تذکرہ کہہ بیٹھے کہ لالہ جی امتحان کے دن قریب آتے جاتے ہیں۔ آپ سحر خیز ہیں۔ ذرا ہمیں بھی صبح جگا دیا کیجئے۔

وہ حضرت بھی معلوم ہوتا ہے نفلوں کے بھوکے بیٹھے تھے۔ دوسرے دن اٹھتے ہی انھوں نے ایشور کا نام لے کر ہمارے دروازے پر مکا بازی شروع کر دی۔ کچھ دیر تک تو ہم سمجھے کہ عالم خواب ہے۔ ابھی ۔ے کیا فکر۔ جاگیں گے تو لاحول پڑھ لیں گے لیکن یہ گولہ باری لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی۔ اور صاحب جب کمرے کی چوبی دیواریں لرزنے لگیں۔ صراحی پر رکھا ہوا گلاس جلترنگ کی طرح بجنے لگا۔ اور دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر پنڈولم کی طرح ہلنے لگا تو بیداری کا قائل ہونا ہی پڑا۔ مگر اب دروازہ ہے کہ لگاتار کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ میں کیا میرے آباؤ اجداد کی روحیں اور میری قسمت خوابیدہ تک جاگ اٹھی ہو گی۔ بہتیرا آوازیں دیتا ہوں۔۔۔۔ ''اچھا۔۔۔۔ اچھا! ۔۔۔ ۔۔تھینک یو!۔۔۔ جاگ گیا ہوں۔۔۔۔ بہت اچھا! نوازش ہے!'' آپ جناب ہیں کہ سنتے ہی نہیں۔ خدایا کس آفت کا سامنا ہے؟ یہ سوتے کو جگا رہے ہیں یا مردے کو جلا رہے ہیں! اور حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں ''قم'' کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا۔ نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے۔ تو پیں تھوڑی داغا کرتے تھے؟ یہ تو ہم سے بھلا کیسے ہو سکتا تھا کہ اٹھ کر دروازے کی چٹخنی کھول دیتے۔ پیشتر اس کے کہ بستر سے باہر نکلیں دل کو جس قدر سمجھانا بجھانا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اہل ذوق ہی لگا سکتے ہیں۔ آخر کار جب لمپ جلایا۔ اور ان کو باہر سے روشنی نظر آئی تو طوفان تھما۔

اب جو ہم کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتے ہیں تو جناب ستارے ہیں کہ جگمگا رہے ہیں! سوچا آج پتہ چلائیں گے۔ یہ سورج آخر کس طرح سے نکلتا ہے۔ لیکن جب گھوم گھوم کر کھڑکی میں سے اور روشندان میں سے چاروں طرف دیکھا اور بزرگوں سے صبح کاذب کی جتنی نشانیاں سنی تھیں۔ ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہ آئی تو فکر سا لگ گیا۔ کہ آج کہیں سورج گرہن نہ ہو۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو پڑوسی کو آواز دی: ''لالہ جی۔۔۔ لالہ جی''

جواب آیا: ''ہوں''

میں نے کہا: ''آج یہ کیا بات ہے۔ کچھ اندھیر اندھیرا سا ہے؟''

کہنے لگے: ''تو اور کیا تین بجے ہی سورج نکل آئے؟''

تین بجے کا نام سن کر ہوش گم ہو گئے۔ چونک کر پوچھا: ''کیا کہا تم نے، تین بجے ہیں؟''

کہنے لگے: ''تین۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔ کچھ سات۔۔۔۔ ساڑھے سات۔۔ منٹ اوپر تین ہیں۔''

میں نے کہا: ''ارے کم بخت، خدائی فوجدار، بدتمیز کہیں کے، میں نے تجھ سے یہ کہا تھا کہ صبح جگا دینا یا یہ کہا تھا کہ سرے سے سونے ہی نہ دینا؟ تین بجے جاگنا بھی کوئی شرافت ہے؟ ہمیں تو نے کوئی ریلوے گارڈ سمجھ رکھا ہے۔ تین بجے ہم اٹھ سکا کرتے تو اس وقت دادا جان کے منظور نظر نہ ہوتے۔ ابے احمق کہیں کے تین بجے اٹھ کر ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ امیر زادے ہیں۔ کوئی مذاق ہے؟۔ لاحول ولا قوۃ''۔

دل تو چاہتا تھا کہ عدم تشدد و شدد کو خیر باد کہہ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بنی نوع انسان کی اصلاح کا ٹھیکہ کوئی ہمیں نے لے رکھا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے غرض۔ لیمپ بجھایا اور بڑبڑاتے ہوئے پھر سو گئے۔

اور پھر حسب معمول نہایت اطمینان کے ساتھ بھلے آدمیوں کی طرح اپنے دس بجے اٹھے۔ بارہ بجے منہ ہاتھ دھویا اور چار بجے چائے پی کر ٹھنڈی سڑک سیر کو نکل گئے۔

شام کو واپس ہوسٹل میں وارد ہوئے۔ جوش شباب تو ہے ہی۔ اس پر شام کا ارمان انگیز وقت۔ ہوا بھی نہایت لطیف تھی۔ طبیعت بھی ذرا مچلی ہوئی تھی۔ ہم ذرا ترنگ میں

گاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے کہ

بلائیں زلف جاناں کی اگر لیتے تو ہم لیتے

کہ اتنے میں پڑوسی کی آواز آئی: ''مسٹر''!

ہم اس وقت ذرا چٹکی بجانے لگے تھے۔ بس انگلیاں وہیں پر رُک گئیں اور کان آواز کی طرف لگ گئے۔ ارشاد ہو: ''یہ آپ گا رہے ہیں؟'' (زور ''آپ'' پر)۔

میں نے کہا: ''اجی میں کس لائق ہوں۔ لیکن خیر فرمایئے؟''

بولے: ''ذرا۔۔۔ وہ میں۔۔۔ میں ڈسٹرب ہوتا ہوں''۔

بس صاحب۔ ہم میں جو موسیقیت کی روح پیدا ہوئی تھی فوراً مر گئی۔ دل نے کہا: ''او نابکار انسان دیکھ! پڑھنے والے یوں پڑھتے ہیں''۔ صاحب۔ خدا کے حضور میں گڑگڑا کر دعا مانگی کہ ''خدایا ہم بھی اب باقاعدہ مطالعہ شروع کرنے والے ہیں۔ ہماری مدد کر اور ہمیں ہمت دے۔''

آنسو پونچھ کر اور دل کو مضبوط کر کے میز کے سامنے آ بیٹھے۔ دانت بھینچ لیے۔ نکٹائی کھول دی۔ آستینیں چڑھا لیں لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کریں کیا؟ سامنے سرخ، سبز، زرد، سبھی قسم کی کتابوں کا انبار لگا تھا۔ اب ان میں سے کون سی پڑھیں؟ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے کتابوں کو ترتیب سے میز پر لگا دیں۔ کہ باقاعدہ مطالعہ کی پہلی منزل یہی ہے۔

بڑی تقطیع کی کتابوں کو علیحدہ رکھ دیا۔ چھوٹی تقطیع کی کتابوں کو سائز کے مطابق الگ قطار میں کھڑا کر دیا۔ ایک نوٹ پیپر پر ہر کتاب کے صفحوں کی تعداد لکھ کر سب کو جمع کیا۔ پھر 15 اپریل تک کے دن گنے۔ صفحوں کی تعداد کو دنوں کی تعداد پر تقسیم کیا۔ ساڑھے پانسو جواب آیا۔ لیکن اضطراب کی کیا مجال جو چہرے پر ظاہر ہونے پائے۔ دل میں کچھ تھوڑا سا پچھتائے کہ صبح تین ہی بجے کیوں نہ اٹھ بیٹھے۔ لیکن کم خوابی کے طبی پہلو پر غور کیا تو فوراً اپنے آپ کو ملامت کی۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ تین بجے اٹھنا تو لغویات ہے۔ البتہ پانچ۔ چھ۔ سات بجے کے قریب اٹھنا نہایت معقول ہوگا۔ صحت بھی قائم رہے گی اور امتحان کی تیاری بھی باقاعدہ ہوگی۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ سویرے اٹھنا ہو تو جلدی ہی سو جانا چاہیے۔ کھانا باہر ہی

سے کھا آئے تھے۔ بستر میں داخل ہو گئے۔

چلتے چلتے خیال آیا کہ لالہ جی سے جگانے کے لیے کہہ ہی نہ دیں؟ یوں ہماری اپنی قوت ارادی کافی زبردست ہے۔ جب چاہیں اٹھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے؟ ڈرتے ڈرتے آواز دی: ''لالہ جی''

انھوں نے پتھر کھینچ مارا: ''پلس''

ہم اور بھی سہم گئے۔ کہ لالہ جی کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ تتلا کے درخواست کی کہ ''لالہ جی صبح آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ کل اگر ذرا مجھے چھ بجے یعنی جس وقت چھ بجیں۔۔۔۔۔۔؟''

جواب ندارد۔

میں نے پھر کہا: ''جب چھ بج چکیں تو۔۔۔۔ سنا آپ نے؟'' چپ۔

''لالہ جی''

کڑکتی ہوئی آواز نے جواب دیا: ''سن لیا۔ سن لیا۔ چھ بجے جگا دوں گا۔ تھری گاما پلس فور ایلفا پلس۔۔۔۔۔''

ہم نے کہا: ''ب۔ب۔ب بہت اچھا۔ یہ بات ہے''

توبہ۔ خدا کسی کا محتاج نہ کرے۔

لالہ جی بہت شریف آدمی ہیں۔ اپنے وعدے کے مطابق دوسرے دن صبح چھ بجے انھوں نے دروازے پر گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ ان کا جگانا تو محض ایک سہارا تھا۔ ہم خود ہی انتظار میں تھے کہ یہ خواب ختم ہو لے تو بس جاگتے ہیں۔ وہ نہ جگاتے تو میں خود ایک منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیتا۔ بہرصورت جیسا کہ میرا فرض تھا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے اسے اس شکل میں قبول کیا کہ گولہ باری بند کر دی۔

اس کے بعد کے واقعات ذرا بحث طلب سے ہیں۔ اور ان کے متعلق روایات میں کسی قدر اختلاف ہے۔ بہرحال اس بات کا تو مجھے یقین ہے اور میں قسم بھی کھا سکتا ہوں کہ آنکھیں میں نے کھول دی تھیں۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیک اور سچے مسلمان کی طرح کلمہ شہادت بھی پڑھا۔ پھر یہ بھی یاد ہے کہ اٹھنے سے پیشتر دیباچے کے طور پر ایک

آدھ کروٹ بھی لی۔ پھر کا پتہ نہیں۔ شاید لحاف اوپر سے اتار دیا۔ شاید سر اس میں لپیٹ دیا۔ یا شاید کھانسا۔ کہ خدا جانے خراٹا لیا۔ خیر یہ تو یقینی امر ہے کہ دس بجے ہم بالکل جاگ رہے تھے۔ لیکن لالہ جی کے جگانے کے بعد اور دس بجے سے پیشتر خدا جانے ہم پڑھ رہے تھے یا سو رہے تھے۔ نہیں ہمارا خیال ہے، پڑھ رہے تھے یا شاید سو رہے ہوں۔ بہرصورت یہ نفسیات کا مسئلہ ہے جس میں نہ آپ ماہر ہیں نہ میں۔ کیا پتہ۔ لالہ جی نے جگایا ہی دس بجے ہو یا اس دن چھ دیر میں بجے ہوں۔ خدا کے کاموں میں ہم آپ کیا دخل دے سکتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل میں دن بھر یہ شبہ رہا کہ قصور کچھ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ جناب شرافت ملاحظہ ہو کہ محض اس شبہ کی بنا پر صبح سے شام تک ضمیر کی ملامت سنتا رہا۔ اور اپنے آپ کو کوستا رہا۔ مگر لالہ جی سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا اور اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، حد درجے کی طمانیت ظاہر کی کہ آپ کی نوازش سے میں نے صبح کا سہانا اور روح افزا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا۔ ورنہ اور دنوں کی طرح آج بھی دس بجے اٹھتا: ''لالہ جی! صبح کے وقت دماغ کیا صاف ہوتا ہے۔ جو پڑھو خدا کی قسم فوراً یاد ہو جاتا ہے۔ بھئی خدا نے صبح بھی کیا عجیب چیز پیدا کی ہے۔ یعنی اگر صبح کی بجائے صبح، صبح شام ہوا کرتی تو دن کیا بری طرح کٹتا''۔

لالہ جی نے ہماری اس جادو بیانی کی داد یوں دی کہ آپ پوچھنے لگے:

''تو میں آپ کو چھ بجے جگا دیا کروں نا؟''

میں نے کہا: ''ہاں ہاں! واہ۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ بے شک''۔

شام کے وقت آنے والی صبح کے مطالعہ کے لیے دو کتابیں چھانٹ کر میز پر علیحدہ جوڑ لیں۔ کرسی کو چار پائی کے قریب سرکا لیا۔ اوور کوٹ اور گلو بند کو کرسی کی پشت پر آویزاں کر دیا۔ کنٹوپ اور دستانے پاس ہی رکھ لیے۔ دیا سلائی کو تکیے کے نیچے ٹٹولا۔ تین دفعہ آیتہ الکرسی پڑھی۔ اور دل میں نہایت ہی نیک منصوبے باندھ کر سو گیا۔

صبح لالہ جی کی پہلی دستک کے ساتھ ہی جھٹ آنکھ کھل گئی۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ لحاف کی ایک کھڑکی میں سے ان کو ''گڈ مارننگ'' کیا۔ اور نہایت بیدردانہ لہجے میں کھانسا۔ لالہ جی مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

ہم نے اپنی ہمت اور اولوالعزمی کو بہت سراہا۔ کہ آج ہم فوراً ہی جاگ اٹھے۔ دل سے کہا کہ ''دل بھیا! صبح اٹھنا تو محض ذرا سی بات ہے۔ ہم یوں ہی اس سے ڈرا کرتے تھے''۔ دل نے کہا: ''اور کیا؟ تمھارے تو یوں ہی اوسان خطا ہو جایا کرتے ہیں''۔ ہم نے کہا: ''سچ کہتے ہو یار۔ یعنی اگر ہم سستی اور کسالت کو خود اپنے قریب نہ آنے دیں تو ان کی کیا مجال ہے کہ ہماری باقاعدگی میں خلل انداز ہوں۔ اس وقت اس لاہور شہر میں ہزاروں ایسے کاہل لوگ ہوں گے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کے مزے اڑاتے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ ادائے فرض کی خاطر نہایت شگفتہ طبعی اور غنچہ دہنی سے جاگ رہے ہیں۔ بھئی کیا برخوردار سعادت آثار واقع ہوئے ہیں''۔ ناک کو سردی سی محسوس ہونے لگی تو اسے ذرا یوں ہی سا لحاف کی اوٹ میں کر لیا۔ اور پھر سوچنے لگے۔ ''خوب! تو ہم آج کیا وقت پر جاگے ہیں۔ بس ذرا اس کی عادت ہو جائے تو باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت اور فجر کی نماز بھی شروع کر دیں گے۔ آخر مذہب سب سے مقدم ہے۔ ہم بھی کیا روز بروز الحاد کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں۔ نہ خدا کا ڈر نہ رسول کا خوف۔ سمجھتے ہیں کہ بس اپنی محنت سے امتحان پاس کر لیں گے۔ اکبر بچارا یہی کہتا کہتا مر گیا۔ لیکن ہمارے کان پر جوں تک نہ چلی۔۔۔۔۔'' (لحاف کانوں پر سرک آیا) ۔۔۔۔۔۔ ''تو گویا آج ہم لوگوں سے پہلے جاگے ہیں۔ ۔۔۔۔۔۔ بہت ہی پہلے یعنی کالج شروع ہونے سے بھی چار گھنٹے۔۔۔۔۔۔ کیا بات ہے۔ خداوندان کالج بھی کس قدر سست ہیں! ہر ایک مستعد انسان کو چھ بجے تک قطعی جاگ اٹھنا چاہیے سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج سات بجے کیوں نہ شروع ہوا کرے۔۔۔۔۔۔۔'' (لحاف سر پر) ۔۔۔۔۔۔ ''بات یہ ہے کہ تہذیب جدید ہماری تمام اعلیٰ قوتوں کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ عیش پسندی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔'' (آنکھیں بند) ۔۔۔۔۔۔ ''تو اب چھ بجے ہیں۔ تو گویا تین گھنٹے تو متواتر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ پہلے کونسی کتاب پڑھیں۔ شیکسپیئر یا ورڈزورتھ؟ میں جانوں شیکسپیئر بہتر ہو گا۔ اس کی عظیم الشان تصانیف میں خدا کی عظمت کے آثار دکھائی دیتے ہیں اور صبح کے وقت [illegible] کی یاد سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے؟ پھر خیال آیا کہ دن کو جذبات کے محشرستان سے، شروع کرنا ٹھیک فلسفہ نہیں۔ ورڈزورتھ

پڑھیں۔ اس کے اوراق میں فطرت کو سکون و اطمینان میسر ہوگا۔ اور دل اور دماغ نیچر کی خاموش دل آویزیوں سے ہلکے ہلکے لطف اندوز ہوں گے۔۔ لیکن شیکسپیئر ۔۔۔۔ نہیں ورڈزورتھ ہی ٹھیک رہے گا۔ ۔۔۔ شیکسپیئر ۔۔۔۔ ہیملٹ ۔۔۔۔ لیکن ورڈزورتھ ۔۔۔۔ لیڈی میکبتھ ۔۔۔۔ دیوانگی ۔۔۔۔ سبزہ زار ۔۔۔۔ سنجر سنجر ۔۔۔۔ باد بہاری ۔۔۔۔ صدِ ہوس ۔۔۔۔ کشمیر ۔۔۔۔ میں آفت کا پرکالہ ہوں ۔۔۔۔

یہ معمہ اب مابعدالطبیعات ہی سے تعلق رکھتا ہے کہ پھر جو ہم نے لحاف سے سر باہر نکالا اور ورڈزورتھ پڑھنے کا ارادہ کیا تو وہی دس بج رہے تھے۔ اس میں نا معلوم کیا بھید ہے!

کالج ہال میں لالہ جی ملے، کہنے لگے: ''مسٹر صبح میں نے پھر آپ کو آواز دی تھی۔ آپ نے جواب نہ دیا؟''

میں نے زور کا قہقہہ لگا کر کہا: ''اوہو! لالہ جی یاد نہیں۔ میں نے آپ کو گڈ مارننگ کہا تھا؟ میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا تھا''

بولے: ''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعد میں ۔۔۔۔ اس کے بعد ۔۔۔۔ کوئی سات بجے کے قریب میں نے آپ سے تاریخ پوچھی تھی۔ آپ بولے ہی نہیں۔''

ہم نے نہایت تعجب کی نظروں سے ان کو دیکھا۔ گویا وہ پاگل ہو گئے ہیں اور پھر ذرا متین چہرہ بنا کر ماتھے پر تیوری چڑھائے غور و فکر میں مصروف ہو گئے۔ ایک آدھ منٹ تک ہم اس تعمق میں رہے۔ پھر یکا یک ایک محبوبانہ اور معشوقانہ انداز سے مسکرا کر کہا: ''ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں اس وقت ۔۔۔۔ اے ۔۔۔۔ اے ۔۔۔۔ نماز پڑھ رہا تھا۔''

لالہ جی مرعوب ہو کر چل دیئے۔ اور ہم اپنے زہد و اتقا کی مسکینی پر سر نیچا کیے کمرے کی طرف چلے آئے۔

اب یہی ہمارا روز مرہ کا معمول ہو گیا ہے۔ جاگنا نمبر ایک چھ بجے۔ جاگنا نمبر دو دس بجے۔ اس دوران میں لالہ جی آواز دیں تو نماز۔

جب دل مرحوم ایک جہانِ آرزو تھا تو یوں جاگنے کی تمنا کیا کرتے تھے کہ ''ہمارا فرق نازِ محو بالش کم خواب ہو''۔ اور سورج کی پہلی کرنیں ہمارے سیاہ پر پیچ بالوں پر پڑ رہی

ہوں۔ کمرے میں پھولوں کی بوئے سحری روح افزائیاں کر رہی ہو۔ نازک اور حسیں ہاتھ اپنی انگلیوں سے بربط کے تاروں کو ہلکے ہلکے چھیڑ رہے ہوں اور عشق میں ڈوبی ہوئی سریلی اور نازک آواز مسکراتی ہوئی گا رہی ہو۔

''تم جاگو موہن پیارے''

خواب کی سنہری دھند آہستہ آہستہ موسیقی کی لہروں میں تحلیل ہو جائے اور بیداری ایک خوشگوار طلسم کی تاریکی کے باریک نقاب کو خاموشی سے پارہ پارہ کر دے۔ چہرہ کسی کی نگاہ اشتیاق کی گرمی محسوس کر رہا ہو۔ آنکھیں مسحور ہو کر کھلیں اور چار ہو جائیں۔ دل آویز تبسم صبح کو اور بھی درخشندہ کر دے اور گیت ''سانوری صورت توری من کو بھائی'' کے ساتھ ہی شرم و حجاب میں ڈوب جائے۔

نصیب یہ ہے کہ پہلے ''مسٹر، مسٹر!'' کی آواز اور دروازے کی دنا دن سا معہ نوازی کرتی ہے اور پھر چار گھنٹے بعد کالج کا گھڑیال دماغ کے ریشے ریشے میں دس بجانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اس چار گھنٹے کے عرصہ میں گڑیوں کے گر پڑنے ۔۔۔۔ دیگچیوں کے الٹ جانے۔ دروازوں کے بند ہونے۔ کتابوں کے جھاڑنے۔ کرسیوں کے گھسیٹنے۔ کلیاں اور غرغرے کرنے۔ کھنکھارنے اور کھانسنے کی آوازیں تو گویا فی البدیہہ ٹھمریاں ہیں۔ اندازہ کر لیجیے کہ ان سازوں میں سرتال کی کس قدر گنجائش ہے۔

موت مجھ کو دکھائی دیتی ہے
جب طبیعت کو دیکھتا ہوں میں

ماہنامہ پنکھڑیاں جولائی 1925ء